

تفسیر القرآن النور

(۶)

تم میں سے جو لوگ مجرّد ہوں، اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں، ان کے نکاح کرو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا، اللہ بڑی وسعت والا ہے۔

یہ اصل میں لفظ ایامی استعمال ہوا ہے جسے عام طور پر لوگ محض بیوہ عورتوں کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ حالانکہ دراصل اس کا اطلاق ایسے تمام مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو بے زوج ہوں۔ ایامی جمع ہے ایتیم کی اور ایتیم ہر اُس مرد کو کہتے ہیں جس کی کوئی بیوی نہ ہو، اور ہر اُس عورت کو کہتے ہیں جس کا کوئی شوہر نہ ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ مجرّد کیا ہے۔

یہ یعنی جن کا رویہ تمہارے ساتھ بھی اچھا ہو، اور جن میں تم یہ صلاحیت بھی پاؤ کہ وہ از خود حاجی زندگی بنا لیں گے۔ مالک کے ساتھ جس غلام یا لونڈی کا رویہ ٹھیک نہ ہو اور جس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ توقع بھی نہ ہو کہ شادی ہونے کے بعد اپنے شریک زندگی کے ساتھ اس کا بنا ہونے کا، اُس کا نکاح کر دینے کی ذمہ داری مالک پر نہیں ڈالی گئی ہے، کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دوسرے فرد کی زندگی خراب کرنے کا ذریعہ بن جائیگا۔ یہ شرط آزاد آدمیوں کے معاملے میں نہیں لگائی گئی، کیونکہ آزاد آدمی کے نکاح میں حصہ لینے والے کی ذمہ داری و تحقیقت ایک مشیر، ایک معاون اور ایک ذریعہ تعارف سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اصل رشتہ مانع اور منکوح کی اپنی ہی رضامندی سے ہوتا ہے۔ لیکن غلام یا لونڈی کا رشتہ کرنے کی پوری ذمہ داری اس کے مالک پر ہوتی ہے۔ وہ اگر جان بوجھ کر کسی غریب کو ایک بد مزاج اور بد مرثت آدمی کے ساتھ بندھوا دے تو اس کا سامنا وبال اسی کے سر ہوگا۔

ابنِ علیم ہے۔ اور جز نکاح کا موقع نہ پائیں انہیں چاہیے کہ عفت مآبی اختیار کریں، یہاں تک کہ اللہ

۳۲ بظاہر یہاں صیغہ امر دیکھ کر علماء کے ایک گروہ نے یہ خیال کر لیا کہ ایسا کرنا واجب ہے۔ حالانکہ معاملے کی نوعیت خود تبارہی ہے کہ یہ حکم وجوب کے معنی میں نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص کا نکاح کر دینا اور مرثیہ پر واجب کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر کس کا کس سے نکاح کر دینا واجب ہو؟ اور بالفرض اگر واجب ہو بھی تو خود اس شخص کی کیا حیثیت رہی جس کا نکاح پیش نظر ہے؟ کیا دوسرے لوگ جہاں بھی اس کا نکاح کرنا چاہیں اسے قبول کر لینا چاہیے؟ اگر یہ اس پر فرض ہے تو گوگربا اس کے نکاح میں اس کی اپنی مرضی کا دخل نہیں، اور اگر اسے انکار کا حق ہے تو جن پر یہ کام واجب ہے وہ آخر اپنے فرض سے کس طرح سبکدوش ہوں؟ انہی پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر مجبور فقہاء نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کام کو واجب نہیں بلکہ مندوب قرار دیتا ہے یعنی اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو عام طور پر یہ حکم ہونی چاہیے کہ ان کے معاشرے میں لوگ بن بیاہنے نہ بیٹھے ہیں۔ خاندان دانے ہ دوست، ہمسائے سب اس معاملے میں دلچسپی لیں، اور جس کا کوئی نہ ہو اس کو حکومت اس کام میں مدد دے۔

۳۳ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس کا بھی نکاح ہو جائیگا اللہ اس کو مالدار بنا دیگا، بلکہ مدعا یہ ہے کہ لوگ اس معاملے میں بہت زیادہ حسابی بن کر نہ رہ جائیں۔ اس میں لڑکی والوں کے ایسے بھی ہدایت ہے کہ نیک ڈاٹرن لیب آدمی اگر ان کے ہاں پیغام دے تو محض اس کی غربت دیکھ کر انکار نہ کریں۔ لڑکے والوں کو بھی متین ہے کہ کسی نوجوان کو محض اس لیے نہ بٹھا رکھیں کہ ابھی وہ بہت نہیں کما رہا ہے اور خود نوجوانوں کو بھی نصیحت ہے کہ زیادہ کشائش کے انتظار میں اپنی شادی کے معاملے کو خواہ مخواہ نہ ٹالتے رہیں۔ قوموی آمدنی یا غیر یقینی آمدنی بھی ہونو اللہ کے بھروسے پر شادی کر ڈالنی چاہیے۔ بسا اوقات خود شادی ہی آدمی کے حالات درست ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ بیوی کی مدد سے اخراجات قابو میں آجاتے ہیں۔ ذمہ داریاں سر پر آجانے کے بعد آدمی خود بھی پہلے سے زیادہ محنت اور کوشش کرنے لگتا ہے۔ بیوی معاش کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ مستقبل میں کس کے لیے کیا کما ہے، اسے کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ اچھے حالات بُرے حالات میں بھی بدل سکتے ہیں اور بُرے حالات اچھے حالات میں بھی تبدیل ہو سکتے ہیں۔ لہذا آدمی کو ضرورت سے زیادہ حساب لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے۔

اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں ان سے مکاتبت کر لو اگر تمہیں معلوم

۵۴ ان آیات کی بہترین تفسیر وہ احادیث ہیں جو اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا یا معشر الشباب، من استطاع منكماً الباءة فلیتزوج فانہ اعض لبصر واحد للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ له وجاد، ترجمانوا تم میں سے جو شخص شادی کر سکتا ہو اسے کر سنی چاہیے کیونکہ یہ نگاہ کی بد نظری سے بچانے اور آدمی کی عفت قائم رکھنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ اور جو استطاعت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھے۔ کیونکہ روزے آدمی کی طبیعت کا جوش ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ بخاری و مسلم۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا ثلثۃ حق علی اللہ عونہم، الناکح یرید العفاف، والمکاتب یرید الاداء، والغازی فی سبیل اللہ، تین آدمی ہیں جن کی مدد اللہ کے ذمے ہے، ایک وہ شخص جو پاک دامن رہنے کے لیے نکاح کرے، دوسرے وہ مکاتب جو مال کتابت ادا کرنے کی نیت رکھے، تیسرے وہ شخص جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے۔ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد)۔

۵۵ مکاتبت کے لفظی معنی تو ہیں "لکھا پڑھی"، مگر اصطلاح میں یہ لفظ اس معنی میں بولا جاتا ہے کہ کوئی غلام یا لونڈی اپنی آزادی کے لیے آقا کو ایک معاوضہ ادا کرنے کی پیشکش کرے اور جب آقا اسے قبول کرنے تو دونوں کے درمیان شرائط کی لکھا پڑھی ہو جائے۔ اسلام میں غلاموں کی آزادی کے لیے جو صورتیں رکھی گئی ہیں یہ ان میں سے ایک ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ معاوضہ مال ہی کی شکل میں ہو۔ آقا کے لیے کوئی خاص خدمت انجام دینا بھی معاوضہ بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ فریقین اس پر راضی ہو جائیں۔ معاوضہ ہو جانے کے بعد آقا کو یہ حق نہیں رہتا کہ غلام کی آزادی میں بیچارہ کاٹھیں ڈالے۔ وہ اس کو مال کتابت فراہم کرنے کے لیے کام کرنے کا موقع دیکھا اور مدت مقررہ کے اندر جب بھی غلام اپنے ذمے کی رقم یا خدمت انجام دے دے، وہ اس کو آزاد کر دے گا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک غلام نے اپنی مالکہ سے مکاتبت کی اور مدت مقررہ سے پہلے ہی مال کتابت فراہم کر کے اس کے پاس لے گیا۔ مالکہ نے کہا کہ میں تو یک مشت نہ لوں گی بلکہ سان سبیل اور ماہ بیاہ قسطوں کی صورت میں لوں گی۔ غلام نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے فرمایا یہ رقم بیت اللہ

میں داخل کر دے اور جا تو آزاد ہے پھر مالک کو کہلا بھیجا کہ تیری رقم یہاں جمع ہو چکی ہے، اب تو چاہے یک مرتبے لے
دو ہزیم تجھے سال بسال اور ماہ ب ماہ دیتے رہیں گے و دائرہ نطنی بروایت ابوسعید مغیری،

۱۵۵۔ اس آیت کا مطلب فقہاء کے ایک گروہ نے یہ لیا ہے کہ جب کوئی لوٹدی یا غلام مکاتبت کی ذمہ داری
کرے تو آقا پر اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ یہ عطاء، عمرو بن دینار، ابن سیرین، مسروق، ضحاک، جبکہ زید، عطاء بن یزید
ابن جبر، جبر طبری کا مسلک ہے اور امام شافعی بھی پہلے اسی کے قائل تھے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ واجب نہیں ہے
بلکہ مستحب اور مندوب ہے۔ اس گروہ میں شعبی، مقاتل بن حیان، حسن بصری، عبد الرحمن بن زید، سفیان ثوری،
ابو حنیفہ اور مالک بن انس جیسے بزرگ شامل ہیں، اور آخر میں امام شافعی بھی اسی کے قائل ہو گئے تھے پہلے گروہ
کے مسلک کی تائید و چیریز کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ آیت کے الفاظ میں کاتبتوہم ان سے مکاتبت کر لو یہ الفاظ
صاف طور پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ دوسرے یہ کہ معتبر روایات سے ثابت ہے کہ مشہور
فقہیہ و محدث حضرت محمد بن سیرین کے والد سیرین نے اپنے آقا حضرت انس سے جب مکاتبت کی درخواست کی
اور انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو سیرین حضرت عمر کے پاس شکایت لے گئے مانتہوں نے واقعہ سنا تو
دوڑ لے کر حضرت انس پر پل پڑے اور فرمایا اللہ کا حکم ہے کہ مکاتبت کر لو (بخاری)۔ اس واقعہ سے
استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ حضرت عمر کا ذاتی فعل نہیں تھا بلکہ صحابہ کی موجودگی میں کیا گیا تھا اور کسی نے اس پر اظہار
اختلاف نہیں کیا، لہذا یہ اس آیت کی مستند تفسیر ہے۔ دوسرے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف
تو کاتبتوہم نہیں فرمایا ہے بلکہ فکاتبتوہم و کاتبتوہم خیرا ارشاد فرمایا ہے یعنی ان سے مکاتبت کر لو
اگر ان کے اندر بھلائی پاؤ۔ یہ بھلائی پانے کی شرط ایسی ہے جس کا انحصار مالک کی رائے پر ہے، اور کوئی استعین
معیار اس کا نہیں ہے جسے کوئی عدالت جانچ سکے۔ ثانوی احکام کی یہ شان نہیں ہوا کرتی۔ اس حکم کو تلقین اور
ہدایت ہی کے معنی میں لیا جائے گا نہ کہ ثانوی حکم کے معنی میں۔ اور سیرین کی نظیر کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اس واقعہ
میں کوئی ایک غلام تو تھا جس نے مکاتبت کی درخواست کی ہو۔ ہزار یا غلام عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ میں
موجود تھے، اور بکثرت غلاموں نے مکاتبت کی ہے۔ سیرین والے واقعہ کے سوا کوئی مثال ہم کو نہیں ملتی کہ کسی آقا
کو عدالتی حکم کے ذریعہ سے مکاتبت پر مجبور کیا گیا ہو۔ لہذا حضرت عمرؓ کے اس فعل کو ایک عدالتی فعل سمجھنے کے

ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے۔ اور ان کو اُس مال سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔

بجائے ہم اس معنی میں لیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے درمیان محض قاضی ہی نہ تھے بلکہ افرادِ اہل بیت کے ساتھ ان کا تعلق باپ اور اولاد کا ساتھ تھا۔ بسا اوقات وہ بہت سے ایسے معاملات میں بھی دخل دیتے تھے جن میں ایک باپ تو دخل دے سکتا ہے مگر ایک حاکم عدالت دخل نہیں دے سکتا۔

بھلائی سے مراد تین چیزیں ہیں۔

ایک یہ کہ غلام میں مالِ کتابت ادا کرنے کی صلاحیت ہو یعنی وہ کما کر یا عمت کر کے اپنی آزادی کا فیہ ادا کر سکتا ہو۔ جیسا کہ ایک مُرسل حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا ان علمتم فہم حرفۃ ولا تزلوہم کلاً علی الناس وہ اگر نہیں معلوم ہو کہ وہ کما سکتا ہے تو مکاتبت کرو۔ یہ نہ ہو کہ اسے لوگوں سے بھیک مانگنے پھرنے کے لیے چھوڑ دو (ابن کثیر بحوالہ ابی داؤد)

دوسرے یہ کہ اس میں اتنی دیانت اور راست بازی موجود ہو کہ اس کے قول پر اعتماد کر کے معاہدہ کیا جاسکے۔ ایسا نہ ہو کہ مکاتبت کر کے وہ مالک کی خدمت سے چھٹی چھی پالے اور جو کچھ اس دوران میں کما لے اسے کھاپی کر برابر بھی کر دے۔

تیسرے یہ کہ مالک اس میں ایسے بُرے اخلاقی رجحانات، یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی کے ایسے تلخ جذبات نہ پاتا ہو جن کی بنا پر یہ اندیشہ ہو کہ اس کی آزادی مسلم معاشرے کے لیے خطرناک ہوگی۔ بالفاظِ دیگر اُس سے یہ توقع کی جاسکتی ہو کہ مسلم معاشرے کا ایک اچھا آزاد شہری بن سکے گا نہ کہ آستین کا سانپ بن کر رہے گا۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ معاہدہ سبکی قیدیوں کا بھی تھا جگہ جگہ بارے میں احتیاطیں ملحوظ خاطر رکھنے کی ضرورت تھی۔

۱۷۵۰ یہ عام حکم ہے جس کے مخاطب آغا بھی ہیں۔ عام مسلمان بھی اور اسلامی حکومت بھی۔

آقاؤں کو ہدایت ہے کہ مالِ کتابت میں سے کچھ نہ کچھ معاف کر دو، چنانچہ مستند روایات سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام اپنے مکاتبتوں کو مالِ کتابت کا ایک مستند حصہ معاف کر دیا کرتے تھے، حتیٰ کہ حضرت علی نے تو ہمیشہ اہل حصہ معاف کیا ہے اور اسی کی تلقین فرمائی ہے۔ (ابن جریر)

عام مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ جو مکاتبت بھی اپنا مالِ کتابت ادا کرنے کے لیے ان سے مدد کی درخواست کرے

وہ دل کھول کر اس کی امداد کریں۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے جو مصارف بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ایسے فی الرقاب بھی ہے، یعنی گردنوں کو بند غلامی سے رہا کرانا (سورہ توبہ، رکوع ۸) اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک فک و قبضہ "گردن کا بند کھولنا" ایک بڑی نیکی کا کام ہے (سورہ بقرہ)۔ حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مجھے وہ عمل بتائیے جو مجھ کو جنت میں پہنچا دے۔ حضور نے فرمایا "تو نے بڑے مختصر الفاظ میں بہت بڑی بات پوچھ ڈالی۔ غلام آزاد کر، غلاموں کو آزادی حاصل کرنے میں مدد دے، کسی کو جانور دے تو خوب دودھ دینے والا دے، اور نیرا جو رشتہ دار تیرے ساتھ ظلم سے پیش آئے اس کے ساتھ نیکی کر۔ اور اگر یہ نہیں کر سکتا تو بھوکے کو کھانا کھلا، پیاسے کو پانی پلا، بھلائی کی تلقین کر، برائی سے منع کر۔ اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو اپنی زبان کو روک رکھ، کھلے تو بھلائی کے لیے کھلے ورنہ بند رہے" (بیہقی فی شعب الایمان عن البراء بن عازب)۔ اسلامی حکومت کو بھی ہدایت ہے کہ بیت المال میں جو زکوٰۃ جمع ہو اس میں مکاتب غلاموں کی رہائی کے لیے ایک حصہ خرچ کریں۔

اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ قدیم زمانے میں غلام تین طرح کے تھے۔ ایک، جنگی قیدی۔ دوسرے آزاد آدمی جن کو پکڑ پکڑ کر غلام بنایا اور بیچ ڈالا جاتا تھا۔ تیسرے وہ جو نسوں سے غلام چلے آ رہے تھے اور کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کے آباء و اجداد کب غلام بنائے گئے تھے اور دونوں قسموں میں سے کس قسم کے غلام تھے۔ اسلام جب آیا تو عرب اور بیرون عرب دنیا بھر کا معاشرہ ان تمام اقسام کے غلاموں سے بھرا ہوا تھا اور سارا معاشی و معاشرتی نظام مزدوروں اور نوکروں سے زیادہ ان غلاموں کے سہارے چل رہا تھا۔ اسلام کے سامنے پہلا سوال یہ تھا کہ یہ غلام جو پہلے سے چلے آ رہے ہیں ان کا کیا کیا جائے۔ اور دوسرا سوال یہ تھا کہ آئندہ کے لیے غلامی کے مسئلے کا کیا حل ہے۔ پہلے سوال کے جواب میں اسلام نے یہ نہیں کیا کہ یکجہت قدیم زمانے کے تمام غلاموں پر سے لوگوں کے حقوق ملکیت ساقط کر دیتا، کیونکہ اس سے نہ صرف یہ کہ پورا معاشرتی و معاشی نظام مفلوج ہو جاتا، بلکہ عرب کو امریکہ کی خانہ جنگی سے بدرجہا زیادہ سخت تباہ کن خانہ جنگی سے دوچار ہونا پڑتا اور پھر بھی اصل مسئلہ حل نہ ہوتا جس طرح امریکہ میں حل نہ ہو سکا اور سیاہ فام لوگوں (NEGROS) کی ذلت کا مسئلہ بہر حال باقی رہ گیا۔ اس اجتماع طریق اصلاح کو چھوڑ کر اسلام نے فک و قبضہ کی ایک زبردست اخلاقی تحریک شروع کی اور تلقین و ترغیب مذہبی

احکام اور ملکی قوانین کے ذریعہ سے لوگوں کو اس بات پر ابھارا کہ یا تو آخرت کی نجات کے لیے طوعاً غلاموں کو آزاد
 کر دیں یا اپنے قصوروں کے کفارے ادا کرنے کے لیے مذہبی احکام کے تحت انہیں رہا کریں، یا مالی معاوضے کے کھچڑ
 دیں۔ اس تحریر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ۶۲ غلام آزاد کیے۔ آپ کی بیویوں میں سے صرف ایک بیوی
 حضرت عائشہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۶۷ تھی۔ حضور کے چچا حضرت عباس نے اپنی زندگی میں ۷۰ غلاموں کو
 آزاد کیا۔ حکیم بن حزام نے ۱۰۰، عبداللہ بن عمر نے ایک ہزار، ذوالکلاع، حمیری نے آٹھ ہزار، اور عبدالرحمن بن عوف
 نے تیس ہزار کو رہائی بخشی۔ ایسے ہی واقعات دوسرے صحابہ کی زندگی میں بھی ملتے ہیں جن میں حضرت ابو بکر اور حضرت
 عثمان کے نام بہت ممتاز ہیں۔ خدا کی رضا حاصل کرنے کا ایک عام شوق تھا جس کی بدولت لوگ کثرت سے
 خود اپنے غلام بھی آزاد کرتے تھے اور دوسروں سے بھی غلام خرید کر آزاد کرتے چلے جاتے تھے۔ اس طرح جہاں
 تک پہلے کے غلاموں کا تعلق ہے، وہ خلفائے راشدین کا دغدغہ ختم ہونے سے پہلے ہی تقریباً سب کے سب
 رہا ہو چکے تھے۔ اب رہ گیا آئندہ کا مسئلہ۔ اس کے لیے اسلام نے غلامی کی اس شکل کو تو قطعی حرام اور قانوناً
 مسدود کر دیا کہ کسی آزاد آدمی کو پکڑ کر غلام بنایا اور بیچا اور خریداجائے۔ البتہ جنگی قیدیوں کو صرف اس صورت
 میں غلام بنا کر رکھنے کی اجازت (حکم نہیں بلکہ اجازت)، دی جبکہ ان کی حکومت ہمارے جنگی قیدیوں سے
 تباہ کرنے پر راضی نہ ہو، اور وہ خود بھی اپنا فدیہ امانہ کریں۔ پھر ان غلاموں کے لیے ایک طرف اس امر کا متفق
 کھلا رکھا گیا کہ وہ اپنے مالکوں سے مکاتبت کر کے رہائی حاصل کر لیں اور دوسری طرف وہ تمام ہدایات ان کے
 حق میں موجود رہیں جو قدیم غلاموں کے بارے میں تھیں کہ نیکی کا کام سمجھ کر ضلئے الہی کے لیے انہیں آزاد کیا جائے،
 یا گناہوں کے کفارے میں ان کو آزادی بخش دی جائے، یا کوئی شخص اپنی زندگی تک اپنے غلام کو غلام رکھے اور
 بعد کے لیے وصیت کر دے کہ اس کے مرتے ہی وہ آزاد ہو جائے گا جیسے اسلامی فقہ کی اصطلاح میں تدمیر
 اور ایسے غلام کو مدبر کہتے ہیں، یا کوئی شخص اپنی لونڈی سے نتع کرے اور اس کے ہاں اولاد ہو جائے، اس صورت
 میں مالک کے مرتے ہی وہ آپ سے آپ آزاد ہو جائے گی خواہ مالک نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ یہ
 حل ہے جو اسلام نے غلامی کے مسئلے کا کیا ہے۔ جاہل معترضین اس کو سمجھنے بغیر اعتراضات جڑتے ہیں، اور
 معذرت پیشہ حضرات اس کی معذرتیں پیش کرتے کرتے آخر کار اس امر واقعہ ہی کا انکار کر بیٹھتے ہیں کہ اسلام نے

اور اپنی لونڈیوں کو اپنے ذمیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ خود پاک دامن رہنا چاہتی ہوں، اور جو کوئی مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کے لیے غفور و رحیم ہے۔

غلامی کو کسی نہ کسی صورت میں باقی رکھا تھا۔

۵۹ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر لونڈیاں خود پاک دامن نہ رہنا چاہتی ہوں تو ان کو قحبہ گری پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لونڈی خود اپنی مرضی سے بدکاری کی ترکیب ہو تو وہ اپنے جرم کی آپ ذمہ دار ہے، قانون اس کے جرم پر اسی کو پکڑے گا، لیکن اگر اس کا مالک جبر کر کے اس سے یہ پیشہ کرائے تو ذمہ داری مالک کی ہے اور وہی پکڑا جائیگا۔ اور ظاہر ہے کہ جبر کا سوال پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جبکہ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر مجبور کیا جائے۔ رہا ذمیوی فائدوں کی خاطر کافرو، تو دراصل یہ شرت حکم کے لیے شرط اور قید کے طور پر استعمال نہیں ہوتا ہے کہ اگر مالک اس کی کمائی نہ کھا رہا ہو تو لونڈی کو قحبہ گری پر مجبور کرنے میں وہ مجرم نہ ہو، بلکہ اس سے مقصود اس کمائی کو بھی حرمت کے حکم میں شامل کرنا ہے جو اس ناجائز جبر کے ذریعہ حاصل کی گئی ہو۔

لیکن اس حکم کا پورا مقصد محض اس کے الفاظ اور سیاق و سباق سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان حالات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں یہ نازل ہوا ہے۔ اس وقت عرب میں قحبہ گری کی دو صورتیں رائج تھیں۔ ایک خانگی کا پیشہ۔ دوسرے باقاعدہ چکلہ خانگی کا پیشہ کرنے والی زیادہ تر آزاد شدہ لونڈیاں ہوتی تھیں جن کا کوئی سرپرست نہ ہوتا، یا ایسی آزاد عورتیں ہوتی تھیں جن کی پشت پناہی کرنے والا کوئی خاندان یا قبیلہ نہ ہوتا۔ یہ کسی گھر میں بیٹھ جاتیں اور کئی کئی مردوں سے بیک وقت ان کا معاہدہ ہو جاتا کہ وہ ان کو مدد خرچ دینگے اور اپنی حاجت پوری کرنے رہیں گے۔ جب بچہ پیدا ہوتا تو عورت ان مردوں میں سے جس کے متعلق کہہ دیتی کہ یہ بچہ اس کا ہے اسی کا بچہ وہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ یہ گویا معاشرے میں ایک مسلم ادارہ تھا جسے اہل جاہلیت ایک قسم کا نکاح سمجھتے تھے۔ اسلام نے اگر نکاح کے عرف اس معروف طریقے کو قانونی نکاح قرار دیا جس میں ایک عورت کا صرف ایک شوہر ہوتا ہے اور اس طرح باقی تمام صورتیں زنا میں شمار ہو کر آپ سے آپ جرم ہو گئیں راہوں اور، باب فی وجوہ النکاح اتی کان تینکحہن بل بخلتہن

دوسری صورت، یعنی عملی تمجید گری، تمام ٹرولڈیوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اس کے دو طریقے تھے۔ ایک یہ کہ لوگ اپنی جوان ٹرولڈیوں پر ایک بھاری رقم عائد کر دیتے تھے کہ ہر مہینے اتنا لگا کر ہیں دیا کرو، اور وہ بے چاریاں بدکاری کرنا کر کے یہ مطالبہ پورا کرتی تھیں۔ اس کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے وہ اتنا لگا سکتی تھیں، نہ مالک ہی یہ سمجھتے تھے کہ وہ کسی پاکیزہ کسب کے ذریعہ سے یہ رقم لایا کرتی ہیں، اور نہ جوان ٹرولڈیوں پر عام مزدوری کی شرح سے کسی کٹی گنی رقم عائد کرنے کی کوئی دوسری معقول وجہ رہی ہو سکتی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی جوان اور خوبصورت ٹرولڈیوں کو کونٹوں پر بٹھا دیتے تھے اور ان کے دروازوں پر تختہ لگا دیتے تھے جنہیں دیکھ کر دُور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ "حاجتمند آدمی کہاں اپنی حاجت رفع کر سکتا ہے۔ یہ عورتیں تہلیقیات کہلاتی تھیں اور ان کے گھر "مواخیر" کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے بڑے معزز رئیسوں نے اس طرح کے چمکے کھول رکھے تھے۔ خود عبداللہ بن ابی ریس المنافقین، وہی صاحب جنہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانا طے کر چکے تھے، اور وہی صاحب جو حضرت عائشہؓ تہمت لگانے میں سب سے پیش پیش تھے، مدینے میں ان کا ایک باقاعدہ چمکہ موجود تھا جس میں چھ خوبصورت ٹرولڈیاں رکھی گئی تھیں، ان کے ذریعہ سے وہ صرف دولت ہی نہیں کماتے تھے بلکہ عرب کے مختلف حصوں سے آنے والے معزز بہانوں کی تواضع بھی انہی سے فرمایا کرتے تھے اور ان کی ناجائز اولاد سے اپنے خدم و حشم کی فوج بھی بڑھاتے تھے۔ انہی ٹرولڈیوں میں سے ایک، جس کا نام "معاذہ" تھا، مسلمان ہو گئی اور اپنے توبہ کرنی چاہی۔ ابن ابی نے اس پر تشدد کیا۔ اس نے جا کر حضرت ابوبکرؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے معاملہ سزاوارکے پہنچایا۔ اور سرکار رسالت مآب نے حکم دے دیا کہ ٹرولڈی اس خلاف کے قبضے سے نکال لی جائے (ابن جریر ج ۱ ص ۵۵ تا ۵۸ - ۱۰۳ - ۱۰۴ - الاستیعاب لابن عبدالبرج ۲۰۲ - ۲۰۳ - ابن کثیر ج ۳، ص ۲۸۸ - ۲۸۹)۔ یہی زمانہ تھا جب بارگاہِ خداوندی سے یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں منظرِ نگاہ میں لکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل مقصد ٹرولڈیوں کو جہیمِ ذلت پر مجبور کرنے سے روکنا نہیں ہے بلکہ دولتِ اسلامیہ کے حدود میں تمجید گری (PROSTITUTION) کے کاروبار کو بالکل خلافِ قانون قرار دے دینا ہے اور ساتھ ساتھ ان عورتوں کے لیے اعلانِ معافی بھی ہے جو اس کاروبار میں جبراً استعمال کی گئی ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمان آجانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ لا مساعاة فی الاسلام؛ اسلام میں قحبہ گری کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (ابوداؤد و بروایت ابن عباس، باب فی اوعاء و حلد الزنا)۔ دوسرا حکم جو آپ نے دیا وہ یہ تھا کہ زنا کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی آمدنی حرام، ناپاک اور قطعی ممنوع ہے۔ رافع بن خدیج کی روایت ہے کہ آپ نے ہہرنجی یعنی زنا کے معاوضے کو خبیث اور شرک کا سب، ناپاک اور بدترین آمدنی قرار دیا (ابوداؤد، ترمذی، احمد، نسائی)۔ ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ حضور نے کسب النجی، یعنی پیشہ زنا سے کمائی ہوئی آمدنی کو حرام ٹھہرایا (بخاری، مسلم، احمد)۔ ابومسعود عقیب بن عمر کی روایت ہے کہ آپ نے ہہرنجی کا لین دین ممنوع کر دیا (صحاح سنن و احمد)۔ تیسرا حکم آپ نے یہ دیا کہ لونڈی سے جائزہ طور پر صرف ہاتھ پاؤں کی خدمت لی جاسکتی ہے اور مالک کوئی ایسی رقم اس پر عائد، یا اس سے وصول نہیں کر سکتا جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ یہ رقم وہ کہاں سے اور کیا کر کے لاتی ہے۔ رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ نفعی رسول اللہ علیہ وسلم عن کسب الامۃ حتیٰ یعلم من این ہو؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈی سے کوئی آمدنی وصول کرنا ممنوع قرار دیا جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہ آمدنی اُسے کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔ (ابوداؤد، کتاب الاجارہ)۔ رافع بن رفاعہ انصاری کی روایت میں اس سے زیادہ واضح حکم ہے کہ نہان ابنی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کسب الامۃ الا ما عملت بیدھا و قاتلھنکذا باصابعہ نحو الخبز و الغزل و النفس؛ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو لونڈی کی کمائی سے منع کیا بجز اس کے جو وہ ہاتھ کی محنت سے حاصل کرے، اور آپ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ یوں، جیسے روٹی لگانا، سوت کا تار یا اون اور روٹی دھنکنا "مستد احمد۔ ابوداؤد، کتاب الاجارہ)۔ اسی معنی میں ایک روایت ابوداؤد اور مستد احمد میں حضرت ابوہریرہ سے بھی مروی ہے جس میں کسب الاماء (لونڈیوں کی کمائی) اور ہہرنجی (زنا کی آمدنی) وصول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اس آیت کے منشا کے مطابق قحبہ گری کی ان تمام صورتوں کو مذہباً ناجائز اور قانوناً ممنوع قرار دے دیا جو اس وقت عرب میں رائج تھیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، عبداللہ بن ابی کی لونڈی محاذہ کے معاملہ میں جو کچھ آپ نے فیصلہ فرمایا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس لونڈی سے اُس کا مالک جبراً پیشہ کر لے اُس پر سے

ہم نے صاف صاف ہدایت دینے والی آیات تمہارے پاس بھیج دی ہیں، اور ان قوموں کی عبرتناک مثالیں بھی ہم تمہارے سامنے پیش کر چکے ہیں جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں، اور وہ نصیحتیں ہم نے کر دی ہیں جو ڈرنے والوں کے لیے ہوتی ہیں ۱۱

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں)، اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک

مالک کی ملکیت بھی ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ امام زہری کی روایت ہے جسے ابن کثیر نے مسند عبدالمزین کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

۱۱۔ اس آیت کا تعلق صرف اوپر کی آخری آیت ہی سے نہیں ہے بلکہ اُس پورے سلسلہ بیان سے ہے جو آغاز سورہ سے یہاں تک پڑا آ رہا ہے۔ صاف صاف ہدایتیں دینے والی آیات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں زنا اور عذف اور لعان کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ بدکار مردوں اور عورتوں سے اہل ایمان کو شادی بیاہ کے معاملہ میں متعاملہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، شریف لوگوں پر یہ نبیاً و ہمتیں لگانے اور معاشرے میں خواہش کی اشاعت کرنے سے روکا گیا ہے، مردوں اور عورتوں کو غضب بصر اور حفظ فریج کی تاکید کی گئی ہے، عہدوں کے لیے پردے کے حدود قائم کیے گئے ہیں، شادی کے قابل لوگوں کے مجرور بیٹے رہنے کو ناپسند کیا گیا ہے، غلاموں کی آزادی کے لیے کتابت کی صورت تجویز کی گئی ہے، اور معاشرے کو تعجب گری کی لعنت سے پاک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان ارشادات کے بعد فرمایا جا رہا ہے کہ خدا سے ڈر کر سیدھی راہ اختیار کر لینے والوں کو جس طرح تعلیم دی جاتی ہے وہ تو ہم نے دے دی ہے، اب اگر تم اس تعلیم کے خلاف چلو گے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تم ان قوموں کا سا انجام دیکھنا چاہتے ہو جن کی عبرتناک مثالیں خود اسی قرآن میں ہم تمہارے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ غالباً ایک حکم نامے کے ختم پر اس سے زیادہ سخت تنبیہ کے الفاظ اور کئی نہیں ہو سکتے، مگر آفرین ہے اُس قوم پر جو ما شاء اللہ مومنین بھی ہو اور اس حکم نامے کی تلامذت بھی کرے اور پھر ایسی سخت تنبیہ کے باوجود اس حکم نامے کی خلاف ورزی بھی کرتی رہے!

۱۲۔ یہاں سے روئے سخن منافقین کی طرف پھرتا ہے جو اسلامی معاشرے میں فتنوں پر فتنے اٹھائے

چلے جا رہے تھے اور اسلام، اسلامی تحریک، اور اسلامی ریاست و جماعت کو زک و دینے میں اسی طرح سرگرم تھے جس طرح باہر کے کھلے کھلے کافر دشمن سرگرم تھے۔ یہ لوگ ایمان کے مدعی تھے، مسلمانوں میں شامل تھے، مسلمانوں کے ساتھ و خصوصاً انصار کے ساتھ، رشتہ و برادری کے تعلقات رکھتے تھے، اسی لیے ان کو مسلمانوں میں اپنے فتنے پھیلانے کا زیادہ موقع ملتا تھا، اور بعض محض مسلمان تک اپنی سادہ لوحی یا کمزوری کی بنا پر ان کے آڑ کا بھی بن جاتے تھے اور پشت پناہ بھی۔ لیکن درحقیقت ان کی دنیا پرستی نے ان کی آنکھیں اندھی کر رکھی تھیں اور حملائے ایمان کے باوجود وہ اُس ٹور سے بالکل بے بہرہ تھے جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت دنیا میں پھیل رہا تھا۔ اس موقع پر ان کو خطاب کیے بغیر ان کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا جا رہا ہے اس سے مقصود تین امور ہیں۔ اول یہ کہ ان کو فحاشی کی جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ جو زندہ بھی بہکا اور ٹھیکا مٹا ہو اس کی تمام شرارتوں اور خباثتوں کے باوجود اسے آخر وقت تک سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ دوم یہ کہ ایمان اور نفاق کا فرق صاف صاف کھول کر بیان کر دیا جائے تاکہ کسی صاحب عقل و خرد انسان کے لیے مسلم معاشرے کے مومن اور منافق افراد کے درمیان تمیز کرنا مشکل نہ رہے، اور اس توضیح و تصریح کے باوجود جو شخص منافقوں کے چنڈے میں پھنسے یا ان کی پشت پناہی کرے وہ اپنے اس فعل کا پوری طرح ذمہ دار ہو۔ سوم یہ کہ منافقین کو صاف صاف متنبہ کر دیا جائے کہ اللہ کے جرم و عدے اہل ایمان کے لیے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کو پہنچتے ہیں جو سچے دل سے ایمان لائیں اور پھر اُس ایمان کے ثقل سے پورے کریں۔ یہ وعدے اُن سب لوگوں کے لیے نہیں ہیں جو محض مسلمانوں کی مردم شماری میں شامل ہوں۔ لہذا منافقین اور فاسقین کو یہ امید نہ رکھنی چاہیے کہ وہ ان وعدوں میں سے کوئی حصہ پاسکیں گے۔

۱۷ آسمانوں اور زمین کا لفظ قرآن مجید بالعموم "کائنات" کے معنی میں بولتا ہے۔ لہذا دوسرے الفاظ میں آیت کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا نور ہے۔

نور سے مراد وہ چیز ہے جس کی بدولت اشیاء کا ظہور ہوتا ہے۔ یعنی جو آپ سے آپ ظاہر ہوا اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرے۔ انسان کے ذہن میں نور اور روشنی کا اصل مفہوم یہی ہے۔ کچھ نہ سمجھنے کی

کیفیت کا نام انسان نے اندھیرا اور تاریکی اور ظلمت رکھا ہے، اور اس کے برعکس جب سب کچھ سُجھائی دینے لگے اور ہر چیز ظاہر ہو جائے تو آدمی کہتا ہے کہ روشنی ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ "نور" کا استعمال اسی بنیادی مفہوم کے لحاظ سے کیا گیا ہے، نہ اس معنی میں کہ معاذ اللہ وہ کوئی شعاع ہے جو ایک لاکھ ۸۰ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور ہماری آنکھ کے پردے پر پڑ کر دماغ کے مرکز بینائی کو متاثر کرتی ہے۔ روشنی کی یہ مخصوص کیفیت اُس معنی کی حقیقت میں شامل نہیں ہے جس کے لیے انسانی ذہن نے یہ لفظ اختراع کیا ہے، بلکہ اُس پر اس لفظ کا اطلاق ہم اُن روشنیوں کے لحاظ سے کرتے ہیں جو اس مادی دنیا کے اندر ہمارے تجربے میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے انسانی زبان کے غننے الفاظ بھی بولے جاتے ہیں وہ اپنے اصل بنیادی مفہوم کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں نہ کہ اُن کے مادی مولات کے اعتبار سے۔ مثلاً ہم اس کے لیے دیکھنے کا لفظ بولتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ انسان اور حیوان کی طرح آنکھ نامی ایک عضو کے ذریعہ سے دیکھتا ہے۔ ہم اس کے لیے سننے کا لفظ بولتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ہماری طرح کانوں کے ذریعہ سے سُنتا ہے۔ اس کے لیے ہم کپڑا اور گرفت کے الفاظ بولتے ہیں۔ یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ ہاتھ نام کے ایک آلہ سے پکڑتا ہے۔ یہ سب الفاظ اُس کے لیے ہمیشہ ایک اطلاقی شان میں بولے جاتے ہیں اور صرف ایک کم عقل آدمی ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ سماعت اور بینائی اور گرفت کی کوئی دوسری صورت اُس محدود اور مخصوص قسم کی سماعت و بینائی اور گرفت کے سوا ہرگز نہیں ہے جو ہمارے تجربے میں آتی ہے۔ اسی طرح "نور" کے متعلق بھی یہ خیال کرنا محض ایک تنگ خیالی ہے کہ اس کے معنی کا مصداق صرف اُس شعاع ہی کی صورت میں پایا جاسکتا ہے جو کسی چمکنے والے جرم سے نکل کر آنکھ کے پردے پر منعکس ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کا مصداق اس محدود معنی میں نہیں ہے بلکہ مطلق معنی میں ہے، یعنی اس کائنات میں وہی ایک اصل سبب ظہور ہے، باقی یہاں تاریکی اور ظلمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسری روشنی دینے والی چیزیں بھی اُسی کی بخشی ہوئی روشنی سے روشن اور روشن کر ہیں، ورنہ ان کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے جس سے وہ یہ کہ شمع دکھا سکیں۔

نور کا لفظ علم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور اس کے برعکس جہل کو تاریکی اور ظلمت سے تعبیر کیا

طاق میں چراغ رکھا ہوا ہے، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرتی ہو نہ غریب، جس کا تیل آپ ہی آپ بظہر کا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اس طرح) روشنی پر روشنی (پڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں)۔ اللہ اپنے نور کی طرف

جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس معنی میں بھی کائنات کا نور ہے کہ یہاں حقائق کا علم اور راہِ راست کا علم اگر مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے۔ اس سے فیض حاصل کیے بغیر جہالت کی تاریکی اور نتیجہً ضلالت و گمراہی کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہے۔

۳۷ مبارک، یعنی کثیر المنافع، بہت سے فائدوں کا حامل۔

۳۸ یعنی جو کھلے میدان میں یا اونچی جگہ واقع ہو، جہاں صبح سے شام تک اُس پر دھوپ پڑتی ہو۔ کسی آد میں نہ ہو کہ اس پر صرف صبح کی یا صرف شام کی دھوپ پڑے۔ زیتون کے ایسے درخت کا تیل زیادہ لطیف ہوتا ہے اور زیادہ تیز روشنی دیتا ہے۔ محض شرتی یا محض غریب رخ کے درخت نسبتہً غلبت تیل دیتے ہیں اور چراغ میں ان کی روشنی ہلکی رہتی ہے۔

۳۹ اس نشیل میں چراغ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو اور طاق سے کائنات کو تشبیہ دی گئی ہے، اور فانوس سے مراد وہ پردہ ہے جس میں حضرت حق نے اپنے آپ کو نگاہِ خلق سے چھپا رکھا ہے۔ گویا یہ پردہ فی الحقیقت خفا کا نہیں، شدتِ ظہور کا پردہ ہے۔ نگاہِ خلق جو اُس کو دیکھنے سے عاجز ہے اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ درمیان میں تاریکی حامل ہے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ درمیان کا پردہ شفاف ہے اور اس شفاف پردے سے گزر کر آنے والا نور ایسا شدید اور وسیع اور محیط ہے کہ محدود طاقت رکھنے والی بینائیاں اس کا ادراک کرنے سے عاجز رہ گئی ہیں۔ یہ کمزور بینائیاں صرف اُن محدود روشنیوں کا ادراک کر سکتی ہیں جن کے اندر کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے، جو کبھی نائل ہوتی ہیں اور کبھی پیدا ہو جاتی ہیں، جن کے مقابلے میں کوئی تاریکی موجود ہوتی ہے اور اپنی ضد کے سامنے آکر وہ نمایاں ہوتی ہیں۔ لیکن نور مطلق جس کا کوئی مد مقابل نہیں، جو کبھی نائل نہیں ہوتا، جو سدا ایک ہی شان سے ہر طرف چھایا رہتا

ہے، اس کا ادراک ان کے بس سے باہر ہے۔

رہا یہ مضمون کہ ”چراغ ایک ایسے درخت زیتون کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو زہر شرتی ہو نہ مغربی“ تو یہ صرف چراغ کی روشنی کے کمال اور اس کی شدت کا تصور دلانے کے لیے ہے۔ قدیم زمانے میں زیادہ سے زیادہ روشنی دوغبن زیتون کے چراغوں سے حاصل کی جاتی تھی، اور ان میں روشن ترین چراغ وہ ہوتا تھا جو بلند اور کھلی جگہ کے درخت سے نکلے ہوئے تیل کا ہو۔ تمثیل میں اس مضمون کا مدعا یہ نہیں ہے کہ اللہ کی ذات، جسے چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے، کسی اور چیز سے طاقت (ENERGY) حاصل کر رہی ہے، بلکہ مقصود یہ کہنا ہے کہ مثال میں معمولی چراغ نہیں بلکہ اس روشن ترین چراغ کا تصور کرو جو تہا کے مشاہدے میں آتا ہے۔ جس طرح ایسا چراغ سارے مکان کو جگمگا دیتا ہے اسی طرح اللہ کی ذات نے ساری کائنات کو بقعہ نور بنا رکھا ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ”اُس کا تیل آپ سے آپ بھر کا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے“، اس سے بھی چراغ کی روشنی کے زیادہ سے زیادہ نیز ہونے کا تصور دلانا مقصود ہے۔ یعنی مثال میں اس انتہائی تیز روشنی کے چراغ کا تصور کرو جس میں ایسا لطیف اور ایسا سخت اشتعال پذیر تیل پڑا ہوا ہو۔ یہ تینوں چیزیں، یعنی زیتون، اور اس کا غیر شرتی و مغربی ہونا، اور اس کے تیل کا آگ لگے بغیر ہی آپ سے آپ بھر کا پڑنا، مستقل اجزائے تمثیل نہیں ہیں بلکہ پہلے جز تمثیل، چراغ کے ضمنی متعلقات ہیں۔ اصل اجزائے تمثیل تین ہیں، چراغ، طاق، اور نالو جس شفاف۔

آیت کا یہ فقرہ بھی لائق توجہ ہے کہ ”اس کے نور کی مثال ایسی ہے“۔ اس سے وہ غلط فہمی رفع ہو جاتی ہے جو کسی شخص کو ”اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے“ کے الفاظ سے ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کو ”نور“ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ اس کی حقیقت ہی بس ”نور“ ہونا ہے۔ حقیقت میں تو وہ ایکنے اتے کامل و اکمل ہے جو صاحب علم، صاحب قدرت، صاحب حکمت وغیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب نور بھی ہے۔ لیکن خود اس کو نور محض اس کے کمال نورانیت کی وجہ سے کہا گیا ہے جیسے کسی کے کمال فیاضی کا حال بیان کرنے کے لیے اس کو خود فیض کہہ دیا جائے، یا اس کے کمال خوبصورتی کا وصف بیان کرنے کے لیے

جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ (اس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے، اُن گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا، اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اذن دے دیا ہے۔ اُن میں ایسے لوگ صبح و شام خود اسی کو سن کے لفظ سے تعبیر کر دیا جائے۔

۱۶۷ یعنی اگرچہ اللہ کا یہ نور مطلق سارے جہان کو منور کر رہا ہے، مگر اس کا ادک ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے ادک کی توفیق، اور اس کے فیض سے مستفیض ہونے کی نعمت اللہ ہی جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے۔ ورنہ ہر طرح اندھے کے لیے دن اور رات برابر ہیں، اسی طرح بے بصیرت انسان کے لیے بجلی اور سورج اور چاند اور تاروں کی روشنی چاہے روشنی ہو مگر اللہ کا نور اس کو سمجھائی نہیں دیتا۔ اس پہلو سے اُس پر نصیب کے لیے کائنات میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ آنکھوں کا اندھا اپنے پاس کی چیز نہیں دیکھ سکتا، یہاں تک کہ جب اس سے ٹکرا کر چوٹ کھا جاتا ہے تب اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ چیز یہاں موجود تھی۔ اسی طرح بصیرت کا اندھا اُن حقیقتوں کو بھی نہیں دیکھ سکتا جو عین اُس کے پہلو میں اللہ کے نور سے جگمگا رہی ہوں۔ اُسے ان کا پتہ صرف اُس وقت چلتا ہے جب وہ ان سے ٹکرا کر اپنی شامت میں گرفتار ہو چکا ہوتا ہے۔

۱۶۸ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جانتا ہے کس حقیقت کو کس مثال سے بہترین طریقہ پر سمجھایا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ جانتا ہے کون اس نعمت کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے۔ جو شخص نور حق کا طالب ہی نہ ہو اور بہتر اپنی دنیوی اغراض ہی میں گم اور مادی لذتوں اور منفعتوں ہی کی جستجو میں منہمک ہو، اُسے زبردستی نور حق دکھانے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس عیب کا مستحق تو وہی ہے جسے اللہ جانتا ہے کہ وہ اس کا طالب اور مخصوص طالب ہے۔

۱۶۹ بعض مفسرین نے اِن گھروں سے مراد مساجد لی ہیں، اور ان کو بلند کرنے سے مراد ان کو تعمیر کرنا اور ان کی تعظیم و تکریم کرنا کیا ہے۔ اور بعض دوسرے مفسرین ان سے مراد اہل ایمان کے گھر لیتے ہیں اور انہیں بلند کرنے کا مطلب ان کے نزدیک انہیں اخلاقی حقیقت سے بلند کرنا ہے، اُن میں اپنے نام

اُس کی تسبیح کرتے ہیں سبھی تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور آقا امت نماز و اداوائے
 زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اُلٹے اور دیدے
 پتھر اُجھانے کی نوبت آجائے گی، اور وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں، تاکہ اللہ ان کے بہترین اعمال
 کی جزا اُن کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔

کی یاد کا اللہ نے اذن دیا ہے۔ یہ الفاظ بظاہر مسجد والی تفسیر کے زیادہ مؤید نظر آتے ہیں، مگر خورد کرنے سے
 معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری تفسیری کے بھی اتنے ہی مؤید ہیں جتنے پہلی تفسیر کے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کی شریعت
 کہانت زدہ فلاسف کی طرح عبادت کو صرف معبود تک ہی محدود نہیں رکھتی، جہاں کا بن یا پجاری
 طبقے کے کسی فرد کی پیشوائی کے بغیر اسم بندگی ادا نہیں کیے جاسکتے، بلکہ یہاں مسجد کی طرح گھر بھی عبادت گاہ
 ہے اور بہتر شخص اپنا پرہیز آپ ہے۔ چونکہ اس سورد سے میں تمام تر خانگی زندگی کو اعلیٰ دار نع بنانے
 کے لیے ہدایات دی گئی ہیں، اس لیے دوسری تفسیر ہم کو موقع و محل کے لحاظ سے زیادہ لگتی ہوئی محسوس
 ہوتی ہے، اگرچہ پہلی تفسیر کو بھی رد کر دینے کے لیے کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔ کیا مضائقہ ہے اگر اس سے
 مراد مومنوں کے گھر امدان کی مسجدیں دونوں ہی ہوں۔

۵۶۹ یہاں ان صفات کی تشریح کر دی گئی جو اللہ کے نور مطلق کا ادراک کرنے اور اس کے فیض سے
 بہرہ مند ہونے کے لیے درکار ہیں۔ اللہ کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے کیونہی جسے چاہا مالا مال کر دیا اور
 جسے چاہا دھکا دیا۔ وہ جسے دیتا ہے کچھ دیکھ کر ہی دیتا ہے، اور نعمت حق دینے کے معاملے میں جو کچھ وہ
 دیکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اُس کی محبت، اور اُس سے دلچسپی، اور اُس کا خوف، اور اُس
 کے انعام کی طلب، اور اس کے غضب سے بچنے کی خواہش موجود ہے۔ وہ دنیا پرستی میں گم نہیں ہے
 بلکہ ساری مصروفیتوں کے باوجود اُس کے دل میں اپنے خدا کی یاد ہی رہتی ہے۔ وہ لپتھیوں میں پڑا نہیں
 رہتا چاہتا بلکہ اُس بلند کی کو عملاً اختیار کرتا ہے جس کی طرف اُس کا مالک اس کی رہنمائی کرے۔ وہ اسی
 سیات سپند روزہ کے فائدوں کا طلبگار نہیں ہے بلکہ اس کی نگاہ آخرت کی ابدی زندگی پر جمی ہوئی ہے یہی
 کچھ دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آدمی کو اللہ کے نور سے بہرہ اندوز ہونے کی توفیق بخشی جائے۔ پھر جب

(اس کے برعکس، جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشتِ بے آب میں ہلاب
 کہ پیاسا اس کو پانی بکھے ہوئے تھا، مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا، بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود
 پایا، جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا، اور اللہ کو حساب لینے دیر نہیں لگتی۔ یا پھر اس کی
 اللہ دینے پر آتا ہے تو اتنا دیتا ہے کہ آدمی کا اپنا دامن ہی تنگ ہو تو دوسری بات ہے، ورنہ اس کی دین
 کے لیے کوئی حد و نوبت نہیں ہے۔

یعنی اس تعلیم حق کہ بصدرِ حق دل قبول کرنے سے انکار کر دیا جو اللہ کی طرف سے اس کے پیغمبر دی،
 اور جو اس وقت اللہ کے پیغمبر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ اوپر کی آیات خود تبارہی ہیں کہ
 اللہ کا نور پانے والوں سے مراد سچے اور صالح مومن ہیں۔ اس لیے اب ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی
 حالت تباہی جا رہی ہے جو اس نور کو پانے کے اصلی اور واحد ذریعے، یعنی رسول ہی کو ماننے اور اس کا
 اتباع کرنے سے انکار کر دیں، خواہ دل سے انکار کریں اور محض زبان سے اقرار ہی ہوں، یا دل اور زبان
 دونوں ہی سے انکاری ہوں۔

لکھ اس مثال میں ان لوگوں کا حال بیان ہوا ہے جو کفر و نفاق کے باوجود بظاہر کچھ نیک اعمال بھی
 کرتے ہوں اور نبی الجملہ آخرت کے بھی قائل ہوں، اور اس خیالی خام میں مبتلا ہوں کہ ایمان صادق، اور
 صفات اہل ایمان، اور اطاعت و اتباع رسول کے بغیر ان کے یہ اعمال آخرت میں ان کے لیے کچھ مفید ہونگے۔
 مثال کے پیرائے میں ان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم اپنے جن ظاہری دنیا نشی اعمال خیر سے آخرت میں فائدے
 کی امید رکھتے ہو ان کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ ریگستان میں چمکتی ہوئی ریت کو دُور سے دیکھ کر جس
 طرح پیاسا یہ سمجھتا ہے کہ پانی کا ایک تالاب سو جہیں مار رہا ہے اور منہ اٹھائے اس کی طرف پراس نکھلنے کی
 امید لیے ہوئے ڈوڑتا چلا جاتا ہے، اسی طرح تم ان اعمال کے تھوڑے بھروسے پر موت کی منزل کا سفر
 طے کرنے چلے جا رہے ہو۔ مگر جس طرح سراب کی طرف دوڑنے والا سب اس جگہ پہنچتا ہے جہاں اسے
 تالاب نظر آ رہا۔ تو کچھ نہیں پاتا، اسی طرح جب تم منزلِ موت میں داخل ہو جاؤ گے تو ہمیں تیر چل
 جانے گا کہ یہاں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جس کا تم کوئی فائدہ اٹھا سکو، بلکہ اس کے برعکس اللہ تمہارے

مثال ایسی ہے جیسے ایک گھر سے سمندر کا اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اُس پر ایک اور موج، اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے، آدمی اپنا ہاتھ نکلے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے۔ جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں ہے۔

گیا تم دیکھتے نہیں ہر کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ

کفر و نفاق کا، اور ان بد اعمالیوں کا جو تم ان نمازشی نیکیوں کے ساتھ کر رہے تھے، حساب لینے اور پورا پورا بدلہ دینے کے لیے موجود ہے۔

۱۷۰۰ اس مثال میں تمام کفار و منافقین کی حالت بیان کی گئی ہے جن میں نمازشی نیکیاں کرنے والے بھی شامل ہیں۔ ان سب کے متعلق بتایا جا رہا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی قطعی اور کامل جہالت کی حالت میں بسر کر رہے ہیں، خواہ وہ دنیا کی اصطلاحوں میں علامہ دہر اور علوم و فنون کے استاذ الاساتذہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی جگہ پھنسا ہوا ہو جہاں مکمل تاریکی ہو، روشنی کی ایک کرن تک نہ پہنچ سکتی ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور ماہر مس خٹکے (ROCKETS) بنا لینے کا نام علم ہے۔ ان کے نزدیک معاشیات اور مالیات اور قانون اور فلسفے میں مہارت کا نام علم ہے مگر حقیقی علم ایک اور چیز ہے، اور اس کی ان کو ہر آنک نہیں لگی ہے۔ اس علم کے اعتبار سے وہ جاہل شخص ہیں اور ایک آن پڑھ دیہاتی ذی علم ہے اگر وہ معرفت حق سے بہرہ مند ہو۔

۱۷۰۰ یہاں پہنچ کر وہ اصل مدعا کھول دیا گیا ہے جس کی تہمد اللہ تُوْر السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ کے مضمون سے اٹھائی گئی تھی۔ جب کائنات میں کوئی نور در حقیقت اللہ کے نور کے سوا نہیں ہے، اور سلا ظہور حقائق اُسی نور کی بدولت ہو رہا ہے، تو جو شخص اللہ سے نور نہ پائے وہ اگر کامل تاریکی میں مبتلا نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ کہیں اور تو روشنی موجود ہی نہیں ہے کہ اس سے ایک کرن بھی وہ پاسکے۔

۱۷۰۰ اوپر ذکر آچکا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا نور ہے مگر اس نور کے ادراک کی توفیق صرف صالح اہل ایمان کو نصیب ہوتی ہے، باقی سب لوگ اس نور کا کامل و شامل کے محبط ہوتے ہوئے بھی اندھوں کی طرح تاریکی میں ٹھٹکنے رہتے ہیں۔ اب اس نور کی طرف رہنمائی کرنے والے بے شمار نشانات ہیں سے

پرندے جو پڑھیں گے اُرد ہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے، اور یہ سب جو کچھ کہتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلانا ہے، پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں۔ اور وہ آسمان سے، ان پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں، اُسے برساتا ہے، پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچا لیتا ہے۔ اُس کی بجلی کی چمک لگا ہوں کو خیرہ کیسے دیتی ہے۔ رات اور دن کا الٹ پھیر وہی کر رہا ہے۔ اس میں ایک سبب ہے آنکھوں والوں کے لیے۔

اور اللہ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا، کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر۔ جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہم نے صاف صاف حقیقت بتانے والی آیات نازل کر دی ہیں، آگے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت اللہ ہی جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسول پر اور ہم نے اطاعت قبول کی، مگر اس کے بعد ان میں صرف چند کو بطور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے کہ دل کی آنکھیں کھولی کر کوئی انہیں دیکھے تو ہر وقت ہر طرف اللہ کو کام کرتے دیکھ سکتا ہے۔ مگر جو دل کے اندر سے ہیں وہ اپنے سر کے دیدے پھاڑ پھاڑ کر بھی دیکھتے ہیں تو انہیں بیولوژی اور ذہنی اور طرح طرح کی دوسری لوجیاں تو اچھی خاصی کام کرتی نظر آتی ہیں مگر اللہ کہیں کام کرتا نظر نہیں آتا۔

۵۵۰ اس سے مراد سردی سے جسے ہوتے بادل بھی ہو سکتے ہیں جنہیں جانا آسمان کے پہاڑ کہا گیا ہو۔ اور زمین کے پہاڑ بھی ہو سکتے ہیں جو آسمان میں بلند ہیں، جن کی چوٹیوں پر جی ہوئی برف کے اثر سے ایسا اوقات ہوا اتنی سرد ہو جاتی ہے کہ بادلوں میں انجا پیدا ہونے لگتا ہے اور ادریں کی شکل میں بارش ہونے لگتی ہے۔

سے ایک گروہ (اطاعت سے) مُنہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسول کی طرف، تاکہ رسول ان کے آپس کے مفصلے کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کُتر جاتا ہے۔ البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسول کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آجاتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں کو (منافقت کا) روگ لگا ہوا ہے؛ یا یہ تنگ میں پڑے ہوئے ہیں یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا؛ اصل بات یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں یا

یعنی اطاعت سے روگردانی ان کے دعوئے ایمان کی خود ترویج دہکتی ہے، اور اس حرکت سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ انہوں نے جھوٹ کہا جب کہا کہ ہم ایمان لائے اور ہم نے اطاعت قبول کی۔

یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ رسول کا فیصلہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اس کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ رسول کی طرف بلایا جانا صرف رسول ہی کی طرف بلایا جانا نہیں بلکہ اللہ اور رسول دونوں کی طرف بلایا جانا ہے۔

۱۱۷ واضح رہے کہ یہ معاملہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی کے لیے نہ تھا، بلکہ آپ کے بعد جو بھی حکوت اسلامی کے منصبِ نصاب پر بہا اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ کرے اس کی عدالت کا مسن واصل اللہ اور رسول کی عدالت کا مسن ہے، اور اس سے مُنہ موڑنے والا وہ حقیقت اُس سے نہیں بلکہ اللہ اور رسول سے مُنہ موڑنے والا ہے۔ اس مضمون کی یہ تشریح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرسل حدیث میں مروی ہے جسے ابن جریر رحمۃ اللہ نے روایت کیا ہے کہ صوفی و صحیحی الی حاکم من حکام المسلمین فلیحییہ فهو ظالم لاحق لہ؛ جو شخص مسلمانوں کے حکام عدالت میں سے کسی حاکم کی طرف بلایا جائے اور وہ حاضر نہ ہو تو وہ ظالم ہے، اُس کا کوئی حق نہیں ہے۔ (احکام القرآن ج ۳، ص ۴۰۵)۔ بالفاظ دیگر ایسا شخص سزا کا بھی مستحق ہے، اور مزید برآں اس کا بھی مستحق ہے کہ اسے برابر باطل فرض کر کے اس کے خلاف یک طرفہ فیصلہ دے دیا جائے۔

۱۱۸ یہ آیات ہیں حقیقت کو صاف صاف کھول کر بیان کر رہی ہیں کہ شریعت الہی کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرنا اور کرنا نہیں لازماً ایمان ہے۔ جو شخص شریعت کی مفید مطلب باتوں کو خوشی سے لپک کر لے، مگر جو کچھ خدا کی شریعت میں اس کی اغراض و خواہشات کے خلاف ہو اسے رد کر دے، اور اس کے مقابلے میں دنیا کے

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور کامیاب وہی ہیں جو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اسکی نافرمانی سے بچیں۔

دوسرے تو انہیں کو ترجیح دے وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے۔ اس کا دعوئے ایمان جھوٹا ہے، کیونکہ وہ ایمان خدا اور رسول پر نہیں، اپنی اغراض اور خواہشات پر رکھتا ہے۔ اس دعوئے کے ساتھ خدا کی شریعت کے کسی جز کو اگر وہ مان بھی رہا ہے تو خدا کی نگاہ میں اس طرح کے ماننے کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

نہ یعنی اس طرز عمل کی تین ہی وجہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی سرے سے ایمان ہی نہ لایا ہو اور منافقانہ طریقے پر محض دعو کا دینے اور مسلم معاشرے میں شرکت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمان ہو گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ ایمان لے آنے کے باوجود اسے اس امر میں الجھی تک شک ہو کہ رسول خدا کا رسول ہے یا نہیں، اور قرآن خدا کی کتاب ہے یا نہیں، اور آخرت واقعی آنے والی ہے بھی یا یہ محض ایک افسانہ تراشیدہ ہے، بلکہ خدا بھی حقیقت میں موجود ہے یا یہ بھی ایک خیال ہے جو کسی مصلحت سے گھڑ لیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ خدا کو خدا اور رسول کو رسول مان کر بھی ان سے ظلم کا اندیشہ رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ خدا کی کتاب نے فلاں حکم دے کر تو ہمیں مصیبت میں ڈال دیا اور خدا کے رسول کا فلاں ارشاد دیا فلاں طریقہ تو ہمارے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو ایسے لوگوں کے ظالم ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس طرح کے خیالات رکھ کر جو شخص مسلمانوں میں شامل ہوتا ہے، ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، اور مسلم معاشرے کا ایک رکن بن کر مختلف قسم کے ناجائز فائدے اس معاشرے سے حاصل کرتا ہے، وہ بہت بڑا دغا باز، خائن اور جعل ساز ہے۔ وہ اپنے نفس پر بھی ظلم کرتا ہے کہ اسے شب و روز کے جھوٹ سے ذلیل ترین خصائل کا پیکر بنانا چلا جانا ہے۔ اور ان مسلمانوں پر بھی ظلم کرتا ہے جو اس کے ظاہری کلمہ شہادت پر اکتفا دکر کے اسے اپنی ملت کا ایک جز مان لیتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ طرح طرح کے معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور اخلاقی تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔